33

اگر تم قرآن کریم پڑھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے ہو تو تم سے بڑھ کر خوش قسمت اَور کوئی نہیں

(فرمودہ 2 اکتوبر 1953ء بمقام ربوہ)

تشہد، تعوّذ اور سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا۔

''ہر ایک کام اپنی تکمیل کے لیے مختلف مدارج چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے کام بھی یکدم نہیں ہو جایا کرتے اور وہ بھی مختلف مدارج میں سے گزرتے ہوئے اپنی تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے کام بھی تدریجی طور پر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ کا نام رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ہے یعنی وہ آہستگی کے ساتھ ایک چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دیتے ہوئے اسے اس کے کمال تک پہنچاتا ہے۔ رب العالمین کے الفاظ نے دونوں طرف کے حالات کو بیان کر دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کے لیے لفظ "رَبّ" ہے۔ کہ وہ یکدم کسی چیز کو کمال تک نہیں پہنچا دیتا۔ بلکہ پیدا کرنے کے بعد تدریجی طور پر اسے ترقی دیتا چلا جاتا ہے۔ اور مخلوق کے حالات کو "اَلْعَالَمِیْن" کے لفظ نے بیان کیا ہے کہ یہ قانون کسی ایک چیز کے لیے نہیں بلکہ وہ ہر ایک چیز کے لیے "رَبّ" ہے۔ پس "رَبّ" کے لفظ نے بتا دیا کہ خدا تعالیٰ جو کام بھی دنیا میں کرتا ہے وہ تدریجی طور پر آہستہ آہستہ کرتا ہے۔ اَور "اَلْعَالَمِیْن" نے بتا دیا کہ یہ قانون مخلوق کے کسی

ایک حصے یا مخلوق کی ضرورتوں میں سے کسی ایک ضرورت کے لیے نہیں بلکہ ساری کی ساری مخلوق کے لیے اور اس مخلوق کی ساری کی ساری ضرورتوں کے لیے ہے۔ اس مضمون سے بیسیوں اَور مضمون پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن میں ان سب مضامین کو بیان کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔

میں اِس وقت صرف خدا تعالیٰ کی صفت "رَبّ" کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ اَور بتا رہا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ کے لیے یہ قانون ہے کہ وہ ہر چیز کو پیدا کر کے بتدریج اُسے اُس کے کمال تک پہنچاتا ہے تو بندہ تو اِس بات پر مجبور بھی ہے کہ وہ کسی کام کو یکدم نہ کرے۔ دیکھو! یہی قرآن کریم جو خدا تعالیٰ کو رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ 1 فرماتا ہے دوسری جگہ خدا تعالیٰ کے متعلق فرماتا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ 2 یعنی خدا تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ اُسے کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ اب "ہو جا" اور "ہو جاتی ہے" کے الفاظ سرعت پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اَور اس کی کامل تخلیق پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ پس جب "کن" کہنے والی ہستی بھی "رَبُّ الْعَالَمِیْنَ" کی صورت میں "کُنْ فَیَکُوْنُ" کو آہستہ آہستہ اور بتدریج ظاہر کرتی ہے تو جو مخلوق معذور اور مجبور ہے۔ وہ تو معذور اور مجبور ہے ہی۔ اُس کی تخلیق تو لازماً آہستہ آہستہ ہوگی۔ اس لیے اس کا ہر فعل ایک تدریج چاہتا ہے۔

یہ تدریج بعض دفعہ زمانہ کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتی لیکن ہوتی ضرور ہے۔ مثلاً ہم کسی چیز کو چُھوتے ہیں تو ہاتھ لگاتے ہی ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ چیز سخت ہے یا نرم ہے، صاف ہے یا کُھردری ہے۔ ہم کسی چیز کو پکڑتے ہیں تو پکڑتے ہی ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ چیز سخت ہے یا نرم ہے، صاف ہے یا کُھردری ہے۔ لیکن ہمارا یہ احساس نتیجہ ہے۔ ہمارے اس نقص کا کہ ہم زمانہ کا احساس سیکنڈوں سے کم میں نہیں کر سکتے۔ حالانکہ زمانہ کا احساس سیکنڈ کے ہزارویں، لاکھویں بلکہ کروڑویں حصہ میں بھی ہوتا ہے۔ جیسے ہم فوٹو لیتے ہیں۔ آج کل فوٹو لینے کا بہت چرچا ہے۔ اب ایک شخص ایک کیمرا خریدتا ہے تو وہ اسے پندرہ بیس روپے کو مل جاتا ہے۔ دوسرا شخص کیمرا خریدتا ہے تو اُسے سو دو سو روپے میں مل جاتا ہے۔ ایک اَور شخص کیمرا خریدتا ہے تو وہ اُسے آٹھ نو سو یا ایک ہزار روپیہ میں ملتا ہے۔ یہ قیمتوں کا فرق کیوں ہے؟ قیمتوں میں فرق کیمرا کی حِسّ کی تیزی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کیمرا ایسا ہوتا ہے جو ایک سیکنڈ کے سَوَیں حصہ میں فوٹو کھینچتا ہے۔ لیکن چونکہ

سیکنڈ کے سویں حصہ میں حرکت ہو جاتی ہے اس لیے تصویر ناقص ہو جاتی ہے۔ ایک اَور کیمرا ہوتا ہے جو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں فوٹو کھینچتا ہے۔ اس کا تصویر کھینچنا چونکہ انسانی جسم کی حرکت سے زیادہ تیز ہوتا ہے اس لیے تھوڑی سی حرکت کا اثر تصویر پر نہیں پڑتا۔ مثلاً انسان اُس وقت سر ہلا دیتا ہے تو کیمرا پر اُس کا اثر نہیں ہوتا۔ تصویر ٹھیک آ جاتی ہے۔ کیونکہ سر ہلانے میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ جس کی نسبت سے کیمرا کی حِسّ زیادہ تیز ہوتی ہے۔ لیکن ایک اَور کیمرا ہوتا ہے جو ایک سیکنڈ کے لاکھویں اور دو لاکھویں حصہ میں بھی فوٹو کھینچ لیتا ہے۔ اس کیمرا کے ذریعہ دوڑتے ہوئے گھوڑے اور اُڑتے ہوئے جہاز کا بھی فوٹو لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں زمانہ کا احساس زیادہ چھوٹا ہوتا ہے۔ اگر وہ کیمرا جو ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصہ میں تصویر کھینچ لیتا ہے اُس کی حِسّ تمہارے ہاتھ میں ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا کہ جب تم کسی چیز کو چُھوتے ہو اور چُھوتے ہی تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ چیز صاف ہے یا کُھردری۔ نرم ہے یا سخت۔ تو اِس چُھونے میں اور احساس میں وقت کا فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ فرق نہایت قلیل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تم کسی چیز پر ہاتھ رکھتے ہو تو فوراً ایک تار دماغ کو جاتی ہے۔ اور دماغ ہاتھ کی چیز کا جائزہ لیکر وہ احساس پیدا کرتا ہے جو تم محسوس کرتے ہو۔ تم کو صرف ہاتھ رکھنے اور ایک احساس حاصل کرنے کا پتا لگتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ہاتھ کے چھونے میں اور احساس میں دو تاروں کے چلنے اور ایک حکم کے آنے کا زمانہ شامل ہوتا ہے۔ جسے تم وقت کے احساس کی کمی کی وجہ سے محسوس نہیں کرتے۔

اِسی طرح تم آنکھ سے دیکھتے ہو تو آنکھ کھولتے ہی تمہیں ایک چیز نظر آ جاتی ہے۔ اور تم سمجھتے ہو کہ آنکھ کھلنے اور اس چیز کو دیکھنے میں کوئی وقفہ نہیں۔ اُس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ تم وقفہ کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آنکھ کھولنے سے آنکھ کے پچھلے اعصاب پر اثر پڑتا ہے۔ اور اُن اعصاب کے ذریعہ دماغ کو اطلاع جاتی ہے۔ اَور دماغ اُسی دیکھے ہوئے نقشہ کو محسوس کرتا ہے۔ اور تم سمجھتے ہو کہ آنکھ دیکھ رہی ہے۔ مگر یہ کام اتنی جلدی ہو جاتا ہے کہ تم اِس وقفہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تمہارے پاس اس وقفہ کو معلوم کرنے کا کوئی آلہ نہیں۔ تصویر کے کیمرا میں وقفہ کا احساس ہوتا ہے۔ سائنسدانوں نے غور کر کے ایسا آلہ نکال لیا ہے جس سے وہ تیز سے تیز

چیزوں کی تصویر لے لیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے کیمرے بھی پائے جاتے ہیں جو ایٹم کے بخارات کی تصویر لے لیتے ہیں۔ حالانکہ ایٹم کے بخارات ایک سیکنڈ میں دس دس پندرہ پندرہ میل چلے جاتے ہیں۔ ان بخارات کی تصویریں لینے کے لیے خاص قسم کے کیمرے ایجاد کیے گئے ہیں۔ ان تصویروں کے ذریعہ ہی سائنسدان ایٹم کی تحقیقات کے سلسلہ میں بعض اَور باتوں کا پتا لگاتے ہیں۔ پس چونکہ تمہارے پاس وہ آلہ نہیں ہوتا جس کے ذریعے تم چھوٹے سے چھوٹے وقفہ کا اندازہ لگا سکو اس لیے تم سمجھتے ہو کہ چُھونے اور پکڑنے اور اس کا احساس کرنے میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بتدریج ہوتا ہے۔ اگر تمہارے پاس وقفہ معلوم کرنے کا آلہ ہوتا تو تمہیں معلوم ہوتا کہ جب تم کسی چیز کو ہاتھ لگاتے ہو تو اُس کا فیصلہ پہلے دماغ نے کیا تھا۔ پھر وہ فیصلہ ہاتھ کو گیا۔ اور اُس نے اُس چیز کا احساس کیا۔ لیکن چونکہ یہ بات جلدی ہو جاتی ہے اس لیے تمہیں اِس کا احساس نہیں ہوتا۔ پس ہر چیز میں ایک تدریج پائی جاتی ہے۔ اور ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، تیسرے کے بعد چوتھا اور چوتھے کے بعد پانچواں قدم اٹھ رہا ہے۔

یا مثلاً تم کھانا کھاتے ہو تم منہ میں لقمہ ڈالتے ہو۔ لیکن صرف منہ میں لقمہ ڈالنے سے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اگر محض منہ میں لقمہ ڈالنے سے ہی تمہیں غذا کا فائدہ حاصل ہو جاتا تو خدا تعالیٰ دانتوں کو پیدا نہ کرتا۔ لقمہ منہ میں ڈالنے کے بعد دانتوں سے اُسے چبایا جاتا ہے۔ پھر اگر صرف دانتوں سے چبانے سے ہی ہم غذا سے فائدہ اٹھا لیتے تو خدا تعالیٰ معدہ پیدا نہ کرتا۔ پھر غذا معدہ میں جاتی ہے اور معدہ مدہانی کی طرح کام کرتا ہے۔ جس طرح ہم کسی برتن میں دہی ڈال کر اُسے مدہانی سے بلوتے ہیں اِسی طرح معدہ غذا کو ہلاتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ کھانا دودھ ہے، دانت اُسے دہی بناتے ہیں اور معدہ اُس دہی کو مدہانی کی طرح پتلا کرتا ہے۔ پھر وہ پتلی کی ہوئی غذا انتڑیوں میں جاتی ہے اور انتڑیاں اُسے ہضم کرتی ہیں۔ پھر آگے انتڑیوں کے تین حصے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر تم انہیں ایک چیز ہی سمجھ لو تب بھی ایک لقمہ جو منہ میں ڈالا گیا چوتھی جگہ جا کر ہضم کے قابل ہوا۔ اگر وہ لقمہ کسی ایک ہی جگہ رکھ دیا جائے تو انسان مر جائے۔ انسان کا معدہ نکال دیا جائے یا اس کی انتڑیاں نکال دی جائیں تو انسان مر جائے یا اس کی زندگی وبال ہو جائے۔ اگر لقمہ والی غذا معدہ میں ڈالی جائے۔ منہ میں نہ ڈالی جائے تو انسان مر جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے دودھ کے کوئی

غذا معدہ میں داخل نہیں کی جاتی۔ کیونکہ معدہ غذا چبانے کا کام نہیں کرسکتا۔ پس غذا ہضم ہونے کے لیے بھی خدا تعالیٰ نے بعض مدارج مقرر کیے ہیں۔

اِسی طرح روحانی غذا کے ہضم ہونے کے لیے بھی کچھ مدارج ہیں۔ یہاں بھی منہ اور معدہ اور انتڑیاں ہوتی ہیں جن میں غذا آہستہ آہستہ ہضم ہوتی ہے۔ جو لوگ اِس نقطہ کو نہیں سمجھتے وہ اپنی عمر ضائع کردیتے ہیں اور وہ صحیح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مسلمان کی زندگی کا دارومدار قرآن کریم پر ہے۔ قرآن کریم ایک غذا ہے جس پر ہمارا گزارہ ہے۔ آگے غذا کی کئی شکلیں ہیں۔ مثلاً آٹے سے روٹی بناتے ہیں۔ سوکھا آٹا پھانکا نہیں جاتا۔ آٹے کو گوندھا جاتا ہے اور پھر اُسی سے پراٹھے، پُھلکے اور تنور کی روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ اِسی طرح آٹے سے تم پنجیری بنالیتے ہو۔ گویا تم اِس آٹے کو کئی شکلوں میں تبدیل کرتے ہو تب جاکر وہ کھانے کے قابل ہوتا ہے۔ اِسی طرح قرآن کریم کی غذا کئی شکلوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ کہیں یہ غذا نماز کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ کہیں یہ روزہ کی شکل اختیار کرگئی ہے، کہیں یہ حج کی شکل اختیار کرگئی ہے، کہیں یہ زکوٰۃ کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ گویا کہیں یہ پکوڑے بن گئی ہے، کہیں پراٹھا بن گئی ہے، کہیں پنجیری بن گئی ہے، کہیں گلگلے بن گئی ہے۔ مگر ہے وہی چیز۔ لیکن اِن چیزوں کا بن جانا کافی نہیں جب تک ہم انہیں چبائیں نہیں، انہیں نگلیں نہیں۔ جب وہ غذا معدہ اور انتڑیوں کے دَور سے نہ نکلے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اِس لیے میں نے "ذہنی جگالی" کی ایک اصطلاح بنائی ہوئی ہے۔ یعنی بغیر "ذہنی جگالی" کے روحانی غذا ہضم نہیں ہوتی۔ ایک جانور معدے سے چارہ نکالتا ہے، پھر اُسے چباتا ہے۔ کیونکہ اُس کے معدے میں اتنا سامان نہیں ہوتا کہ وہ چارہ کو ہضم کرے۔ اور چونکہ معدہ اُس غذا کو ہضم نہیں کرتا اس لیے وہ پہلے جلدی جلدی چارہ کھالیتا ہے۔ اور جب کُھرلی پر بیٹھتا ہے تو وہ جگالی کرتا ہے۔ کیونکہ ایک جانور چوبیس گھنٹے تک خوراک جنگل میں نہیں کھاسکتا ہے۔ اِس لیے وہ جلدی جلدی خوراک کھاتا جاتا ہے۔ لیکن جب کُھرلی پر آتا ہے تو پہلے ایک لقمہ نکالتا ہے اور جگالی کرتا ہے اور اُسے خوب چباتا ہے۔ پھر ایک اَور لقمہ نکالتا ہے اور اُسے چباتا ہے۔ اور پھر ایک اور لقمہ نکالتا ہے اور اُسے چباتا ہے۔ اِسی طرح روحانی جگالی کی کیفیت ہوتی ہے۔ جو شخص قرآن کریم پڑھ لیتا ہے یا اس کی تلاوت کرلیتا ہے قرآن کریم اُسے ہضم نہیں ہوتا۔ اِس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک جانور گھاس کھا

لیتا ہے۔ یا انسان کوئی لقمہ منہ میں ڈال لیتا ہے۔ اگر تم لقمے نگلتے جاؤ اور اُنہیں چباؤ نہیں تو تمہاری انتڑیوں میں سوزش پیدا ہو جائے گی، دست آنے لگ جائیں گے یا قے آ جائے گی اور روٹی باہر نکل آئے گی۔ یہی حال روحانی غذا کا ہے۔ جو لوگ جگالی نہیں کرتے وہ اِس غذا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہودیوں کی مثال اُس گدھے سے دی ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں3۔ جو لوگ جگالی نہیں کرتے۔ وہ کتاب تو پڑھ لیتے ہیں لیکن اس پر غور وفکر نہیں کرتے اور اِس وجہ سے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ قرآن کریم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ان مراتب سے گزارا جائے جس سے اس کے مضامین ہضم ہو جائیں۔ جب تک اسے اُن مراتب سے گزارا نہیں جائے گا وہ ہضم نہیں ہو گا۔

پس قرآن کریم پڑھنے کے بعد سوچنے کی عادت ڈالو۔ اور سوچنے کے بعد اس کی جو تاثیریں ہوتی ہیں اُن پر غور کرو اور دیکھو کہ وہ کہاں کہاں روشنی ڈالتی ہیں۔ تم غور کرو گے تو اس کے مطالب خود بخود نکلتے آئیں گے۔ مثلاً لالٹین کی روشنی جہاں تک روشنی کا سوال ہے وہ میل سے بھی نظر آ جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک رستہ دیکھنے کا سوال ہے وہ پچاس ساٹھ گز تک ختم ہو جاتی ہے۔ تم ایک جگہ پر لالٹین رکھ کر آگے چلے جاؤ تو پچاس ساٹھ گز کے بعد تمہیں رستہ نظر نہیں آ سکے گا۔ اب اس مثال کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے تم سوچو تو تمہیں پتا لگے گا کہ روشنی کی مختلف تاثیریں ہوتی ہیں۔ مثلاً غور کرنے پر تمہیں پتا لگے گا کہ روشنی دائیں گئی ہے بائیں گئی ہے۔ آگے گئی ہے، پیچھے گئی ہے۔ اوپر گئی ہے نیچے نہیں گئی۔ کیونکہ نیچے زمین ہے ورنہ وہ نیچے بھی چلی جاتی۔ چنانچہ اگر تم ایک مشعل اٹھا لو تو تم دیکھو گے کہ اُس کی روشنی نیچے بھی جائے گی۔ گویا اُس کا عمل چھ طرف ہو گا۔ لیکن اگر تم پانی بہاتے ہو تو تم دیکھو گے کہ پانی ہمیشہ نچلی طرف جاتا ہے۔ اگر ایک طرف زمین نیچی ہے تو پانی ایک طرف جائے گا۔ اگر دو طرف نچلی زمین ہے تو پانی دو طرف جائے گا۔ اگر تین طرف نچلی زمین ہے تو پانی تین طرف جائے گا۔ اگر چاروں طرف نچلی زمین ہے تو پانی چاروں طرف جائے گا۔ اور اگر سب طرف اونچی زمین ہے تو پانی وہیں ٹھہرا رہے گا۔

یہی حال روحانی تعلیم کا ہے۔ بعض تعلیمیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو چاروں طرف اثر کرتی

ہیں۔بعض تعلیمیں دوطرف اثر کرتی ہیں۔بعض تعلیمیں اوپر کی طرف اثر ڈالنے والی ہوتی ہیں۔اور بعض نیچے اثر ڈالنے والی ہوتی ہیں۔مثلاً گیس ہے یا دھواں ہے۔گیس اور دھواں ہمیشہ اوپر کی طرف جاتے ہیں۔اسی طرح بعض روحانی تعلیمیں خداتعالیٰ پر اثر کریں گی۔اور بعض تعلیمیں انسانوں پر اثر کریں گی اور بعض صرف اصلاح نفس کے کام آئیں گی۔گویا وہ ایسی ہوں گی جیسے کٹورے میں پانی ڈال لیا جاتا ہے۔غرض اگر تم قرآن کریم پر غور کرو گے تم اُس سے کئی نتائج نکال لو گے۔

محض الفاظ پڑھنے کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے تم معدہ میں کھانا ڈالتے جاؤ اور اُسے دانتوں میں چباؤ نہیں اس صورت میں تمہیں خون کے دست آنے لگ جائیں گے۔تم ہڈیاں ڈالتے جاؤ انہیں چباؤ نہیں تو اِس سے تمہیں اپنڈے سائٹس (Appendicitis)4 اور دوسری امراض لگ جائیں گی۔حالانکہ ہڈی کے اندر گودا اور کھانا ہضم کرنے والا مادہ موجود ہوتا ہے۔پس تم قرآن کریم پر سوچنے اور پھر سوچ کر اُس پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ورنہ تمہاری مثال اُس شخص کی سی ہوگی جو کوئی ایسی چیز استعمال کرتا ہے جس کا نتیجہ مخالف پڑتا ہے۔مثلاً وہ روشنی والا کام پانی سے لیتا ہے اور پانی والا کام روشنی سے لیتا ہے۔دھوئیں سے پانی والے کام لیتا ہے اور پانی سے دھوئیں والے کام لیتا ہے۔اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔خداتعالیٰ ہر چیز سے بالا ہے۔یوں تو وہ ہر جگہ ہے لیکن جہت کے لحاظ سے وہ سب سے بالا ہے۔اُس کے معلوم کرنے کے لیے اوپر جانے والی یعنی دھواں اور گیس کی خاصیت رکھنے والی تعلیموں کی ضرورت ہے۔اور بنی نوع کی اصلاح کے لیے پانی اور روشنی کی خاصیت رکھنے والی تعلیم کام دے گی۔اور اپنے نفس کی اصلاح کے لیے وہ چیز چاہیے جو ایک جگہ ہی ٹھہری رہے۔اگر روحانی تعلیم کو بھی ضرورت کے مطابق استعمال نہ کیا جائے تو وہ بیکار رہتی ہے اور اُس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خداتعالیٰ سب کچھ کرسکتا ہے۔اِس میں کوئی شک نہیں کہ خداتعالیٰ سب کچھ کرسکتا ہے۔لیکن کیا وہ پاگل ہے کہ ہر چیز جو عقل میں آتی ہے یا نہیں آتی کرنے لگ جائے؟ خداتعالیٰ سب کچھ کرسکتا ہے۔وہ چاہے تو سب کو یکدم ماردے۔لیکن وہ سب کو کیوں ماردے؟ اِسی طرح روحانیات میں سب کچھ قواعد کے ماتحت ہوتا ہے۔اگر قواعد کے ماتحت کام نہ

کیا جائے تو نہ خدا تعالیٰ کچھ فائدہ دے سکتا ہے، نہ رسول فائدہ دے سکتا ہے اور نہ قرآن کریم فائدہ دے سکتا ہے۔ پس تم اپنی زندگیوں کو اِس طرح ڈھالو کہ تم زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکو۔ قرآن کریم پڑھو اور اس پر غور کرو، فکر کرو اور اپنی ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

خدا تعالیٰ کی صفات کو ہی لے لو۔ ان کو بھی ضرورت کے مطابق استعمال کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یَـا حَـيُّ و قَيُّـوْم خدا! فلاں شخص کو مار دے تو یہ دعا درست نہیں ہوگی۔ زندہ اور قائم رکھنے والا خدا کسی کو مارے گا کیوں۔ قبولیت دعا کے لیے ضروری ہے کہ اُن صفات کو استعمال کیا جائے جن کا دعا کے ساتھ جوڑ ہو۔ مثلاً ہم یہ کہیں اے حَـيُّ و قَيُّـوْم خدا! تُو میری قوم کو زندہ کر اور اے منتقم خدا! تُو میرے دشمن کو مار دے۔ تو یہ درست ہوگا۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اے حَيُّ و قَيُّوْم خدا! تُو میرے دشمن کو مار دے۔ اَور اے منتقم اور قہار خدا! تُو میری قوم کو ترقی دے۔ کیونکہ زندہ رکھنے والی اور ترقی دینے والی صفات اَور ہیں۔ اور مارنے والی صفات اَور ہیں۔ یا مثلاً رزق کا سوال ہے۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اے حَـيُّ و قَيُّـوْمُ خدا! تُو ہمیں رزق دے۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ اے رازق و باسط خدا! تُو ہمیں رزق دے۔ یا اگر ہم بیمار ہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ اے رازق خدا! تُو ہمیں شفا دے۔ رازق کی صفت بے شک اچھی ہے لیکن شفا دینے کا اس صفت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر شفا کے لیے دعا کرنی ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی صفتِ شافی کا ذکر کرو۔ اور کہو اے شافی خدا! تُو مجھے شفا دے۔ غرض ان صفات کے استعمال میں بھی بڑے غور کی ضرورت ہے۔ اور دعا جو صفات الٰہیہ کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اس میں بھی غور و فکر کی ضرورت ہے ورنہ کوئی دعا کام نہیں دیتی۔

پس تم سوچنے کی عادت ڈالو۔ قرآن کریم پڑھو اور پھر اس پر غور کرو۔ اَور غور کرنے کے بعد اس پر عمل کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم ایک زندہ اور فعال قوم نظر آنے لگ جاؤ گے۔ اور دنیا تمہیں دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔ لوہے کو دیکھ لو۔ یورپ اِس سے انجن بناتا ہے لیکن تم اِس سے محض ہتھوڑے وغیرہ بناتے ہو۔ یا زیادہ سے زیادہ قینچیاں بنا لیتے ہو۔ پرانے زمانے میں عورتیں سیر سیر سونا کانوں میں ڈال لیتی تھیں۔ اُن کے کان لٹک جاتے تھے، اُن میں بڑے بڑے سوراخ

ہوجاتے تھے اور وہ سمجھتی تھیں کہ ہم بڑی مالدار ہیں۔ لیکن اِسی سونے سے یورپ کے ممالک نے بعض اشیاء تیار کیں اور ان کے ذریعہ دوسرے ممالک سے کئی گنا زیادہ مال لے آئے۔ پس کسی چیز کا موجود ہونا کافی نہیں۔ تم اس بات پر فخر نہ کرو کہ تمہارے پاس قرآن کریم موجود ہے۔ اگر تمہارے پاس قرآن کریم موجود ہے تو سوال یہ ہے کہ تم نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا؟ اگر تم قرآن کریم پڑھ کر اِس سے فائدہ اٹھاتے ہو تو تم سے بڑھ کر خوش قسمت اور کوئی نہیں۔ اور اگر تم اِس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو تم سے بڑھ کر بدقسمت بھی اور کوئی نہیں۔ کیونکہ تمہاری جیبوں میں سونا بھرا ہے مگر تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔'' (المصلح 15 نومبر 1953ء)

---

1. الفاتحہ:2
2. یٰسٓ:83
3. مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (الجمعہ: 6)
4. اپنڈے سائٹس:(APPENDICITIS) وہ مرض جس میں آنت سُوج جاتی ہے۔